نوٹ

16

اردو غزل کا ارتقا

تعارف

غزل اردو شاعری کی ایک خاص صنف (قسم) ہے لغت کے اعتبار سے یہ عربی لفظ ہے جس کے معنی عشق و رومان کی باتیں کرنا ہے۔ لیکن غزل کسی بھی زمانے میں اپنے لفظی معنی کی پابند نہیں رہی۔ ہر دور اور ہر زمانے میں غزل گو شاعروں نے مختلف موضوعات اور مختلف مضامین کو غزل کا موضوع بنایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزل میں زندگی کے ہر رنگ کو سمونے کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے۔ اسی لیے یہ انسانی زندگی سے بہت قریب ہے۔ غزل کی اس خوبی کی وجہ سے ہی رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔''

غزل کی پہچان ہے کہ یہ نظم کی طرح مسلسل نہیں ہوتی۔ بلکہ غزل کا ہر شعر مضمون کے لحاظ سے مختلف اور اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔ تمام اشعار ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اسے مطلع کہا جاتا ہے۔ اگر دوسرے شعر میں بھی ایسا ہی ہو تو اسے حسنِ مطلع کہتے ہیں۔ آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے اسے مقطع کہتے ہیں۔ اور غزل کے سب سے اچھے شعر کو شاہ بیت یا بیت الغزل کہا جاتا ہے۔ پانچ، سات اور گیارہ اشعار کی غزل اچھی سمجھی جاتی ہے۔ اگر چہ پرانے شاعروں کے یہاں طویل غزلیں، دوغزلے اور سہ غزلے کہنے کا بھی رواج تھا۔ مگر اب یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اختصار اور تہہ داری غزل کی خوبی ہے۔

غزل کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کی ابتدا عربی قصدے سے ہوئی۔ قصیدے کے ابتدائی حصے میں شاعر عام طور پر حسن و شباب اور بہار کا ذکر کرتا ہے۔ عربی قصیدہ ایران پہنچا تو فارسی میں اسی طرز پر قصیدے کہے جانے لگے اور قصیدے کا یہ ابتدائی حصہ الگ سے شاعری کی ایک موہنی صنف یعنی غزل کہلانے لگا اور عشق و محبت کی باتیں اس کے لیے ضروری سمجھی جانے لگیں۔ اس کے لیے باقاعدہ الفاظ کا الگ نظام بنایا گیا۔ اس کی علامتیں اور ترکیبیں الگ ہوگئیں۔ فارسی سے غزل اردو میں آئی تو یہ تمام چیزیں جو فارسی میں اس کی خصوصیت تھیں اردو میں بھی اس کا ورثہ بن گئیں۔ لیکن اردو شاعروں نے بہت جلد اس ''زندہ صنف سخن'' کو اپنے ماحول میں ایسا ڈھالا کہ یہ پوری طرح ہندوستانی رنگ میں رنگ گئی۔

نوٹ

یہاں شروع سے اب تک اردو غزل کو بہت سے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ اردو شعرار نے غزل کو اپنے جذبات، کیفیات اور حالات کا ترجمان بنایا۔ اس کو خوب صورت اور دلکش لہجہ دیا۔ نرمی، شیرینی، بے ساختگی، لطافت اور نغمگی غزل کی خصوصیات ٹھہریں۔ غزل میں استعمال ہونے والی علامات اور تراکیب مثلاً شراب، ساغر، میخانہ، ساقی، قفس، صیاد، گل چیں اور دار و رسن وغیرہ کو وقت اور ماحول کے مطابق برت کر غزل میں وسعت اور گہرائی پیدا کی۔ اس کی تہہ داری اور لطافت کو اس حد تک بڑھایا کہ مشہور شاعر سیماب اکبرآبادی کے قول کے مطابق غزل اس مقام پر پہنچ گئی ؎

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

تاریخی حوالوں کے مطابق ہندوستان میں اردو شاعری کی ابتدا بارہویں صدی عیسوی میں ہو چکی تھی۔ مگر اردو غزل کی ترقی جس دور میں ہوئی وہ جنوبی ہند (دکن) میں سولہویں صدی کا آخری اور سترہویں صدی کا زمانہ ہے۔ اس عہد میں عادل شاہی اور قطب شاہی خاندانوں نے غزل کی بہت سرپرستی کی۔ قطب شاہی خاندان کے تین بادشاہ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ اور اردو کے اچھے غزل گو شاعر تھے۔ قلی قطب شاہ تو فارسی، اردو اور تلنگی تینوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ یہ اردو میں قطب اور معانی تخلص کرتا تھا۔ قلی قطب شاہ پہلا اردو شاعر ہے جس کا کلیات سب سے پہلے شائع ہوا اس میں پچاس ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ ان میں غزل کے علاوہ مثنوی، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ سلطان قلی قطب شاہ نے اپنی غزلوں میں ہندوستانی روایات و رسوم اور مقامی تشبیہوں اور استعاروں کو فارسی سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا۔ یہ ان کی فن کاری ہے کہ انہوں نے فارسی اور ہندی دونوں رنگوں کو بڑی خوبصورتی سے غزل میں سمو کر اردو غزل کو دلکشی بخشی۔ نمونہ کلام ؎

چھیلی سوں لگیاں ہے من ہمارا
کہ اس بن تئیں ہمیں یکتل قرار

دکن میں محمد قلی قطب شاہ سے ولی دکنی تک اردو غزل گو شاعروں کے جو نام ملتے ہیں ان میں محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، ملک نصرتی، غواصی، بحری، ملا وجہی، حسن شوقی، ملک خوشنود، عوامی اور لطفی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اردو غزل کو ہندوستانی رنگ دینے اور اس کو زیادہ سے زیادہ خوب صورت بنانے کے لیے بڑی اچھی کوششیں کی ہیں۔ نمونے کے چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں ؎

دنیا کا حکمت نا پوچھیں ہرگز حکیماں علم سوں
گاؤ ترانہ عیش کا ہر دم پیا کے نام پر
معانی

جہاں تو واں ہوں میں پیارے منجے کیا کام ہے کس سے
نہ بت خانے کی پروا ہے نہ مسجد کی خبر مجھ کو
معانی

نوٹ

منج نہ سر اپنے حال کا ہے پیا
چت منجے تج خیال کا ہے پیا
عوامی

خوباں کی انجمن میں لالن ہوئے ہیں ساقی
نرل شراب نیہہ کا اِک جام بھر نہ بھیجا
حسن شوقی

یہ بول بولتا ہوں، موتی سوں رولتا ہوں
امریت گھولتا ہوں کھٹ دودھ کے انجن میں
ملا خیالی

دکن کی اردو غزل گوئی کا یہ شاندار زمانہ ولی دکنی پر ختم ہوتا ہے۔ ولی کی غزل میں زبان کا زیادہ نکھرا ہوا روپ ملتا ہے۔ انہوں نے ایک طرف غزل کی پرانی روایت کی پاسداری کی تو ساتھ ہی جدید تقاضوں کو بھی سمجھا۔ اسی لیے ان کی غزل میں تازگی اور توانائی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ عشق و محبت کی کیفیات، تصوف کے رموز اور زندگی کے مختلف تجربوں کو ولی نے بڑی فن کاری سے غزل میں سمویا۔ ان کے کلام میں فارسی اور ہندی روایت کے دونوں دھاروں نے آپس میں مل کر جو رنگ اختیار کیا وہ ہندوستانی ہے۔ نمونہ کلام ؎

نہ ڈھونڈو شہر میں فرہاد و مجنوں کا ٹھکانہ تم
کہ ہے عشاق کا مسکن کبھی صحرا، کبھی پربت
مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے
یاد کرنا ہر گھڑی اس بار کا
ہے وظیفہ ۔ مجھ دل بیمار کا

تاریخی شواہد کے اعتبار سے شمالی ہند میں اردو غزل کی راہ ولی کے ذریعے ہموار ہوئی یعنی ولی کے دلّی آنے کے بعد یہاں کے شاعروں نے ریختہ کی طرف توجہ دی۔ ریختہ سے مراد یہ ہے کہ غزل میں فارسی الفاظ و افعال کے ساتھ ہندی الفاظ و افعال ملے جلے طور پر استعمال کیے گئے۔ یعنی فارسی اور ہندی ایک دوسرے سے گھل مل کر غزل میں پیش ہوئی۔ شمالی ہند میں یہ غزل کا پہلا دور ہے جس میں شاہ مبارک آبروؔ، فائزؔ دہلوی، یکرنگؔ، شاکر ناجیؔ، قائمؔ، شیخ شرف الدین مضمونؔ، یقینؔ، امیر خان انجامؔ، مرزا مظہر جان جاناںؔ، شاہ ظہور الدین حاتمؔ اور خان آرزوؔ جیسے مشہور شاعر ہوئے۔ سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ شمالی ہند

نوٹ

میں بہت ہنگاموں اور پریشانیوں کا تھا۔ مگر اردو کی ترقی کے لیے یہ زمانہ بہتر تھا کیونکہ حکومت کمزور ہونے کے سبب فارسی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ایسے میں شمالی ہند کے شاعروں نے غزل کی روایت کو سنبھالا تو اس میں نت نئے تجربے کیے اور اردو غزل میں ایہام گوئی (یعنی شعر میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جن کے دو معنی نکلتے ہوں ایک قریب کے اور ایک دور کے) رواج پا گئی۔ فارسی ترکیبوں اور تشبیہوں کے ذریعے غزل کو بھاری بھرکم بنا دیا۔ لیکن یہ رنگ زیادہ دن قائم نہ رہ سکا اور تھوڑے عرصے بعد ہی اردو شعراء نے غزل میں سادگی اور سیدھے طرز بیان کو اپنا لیا۔ سلاست اور روانی، خیال کی بلندی اور پاکیزگی کا خیال رکھا جانے لگا۔ تصوف کے مضامین کو غزل میں جگہ دی گئی۔ دنیا کی بے ثباتی اور ملک کی بدحالی کا ذکر غزل میں کیا گیا۔ اس دور کی غزل میں دلی کی تباہی کا چرچا بھی ہے اور لوٹ مار و غارت گری کا ذکر بھی۔ عاشق کی بے کلی کا بیان بھی ہے اور محبوب کی بے توجہی اور ستم کا ذکر بڑے دلکش انداز میں ملتا ہے۔

پانی پت آج چھوڑ جو گئور تم چلے
تو راہ بیچ جائیو جاناں سنبھال کے
آبرو

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیے
کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گذری سو جگ بیتا
آبرو

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں
ایک تو گل بے فاتش پہ جور باغباں
مضمون

ٹک فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم
امیر خان انجام

مرزا مظہر جان جاناں، شاہ ظہور الدین حاتم اور سراج الدین علی خاں آرزو نے زبان کی درستگی، صفائی اور سادگی پر زور دیا۔ سخت اور بھدّے الفاظ اور محاوروں کے استعمال کو ختم کیا اور فارسی کی نئی ترکیبیں اور تشبیہیں ایجاد کیں۔ نئے خیالات کو غزل میں پیش کیا اور ایہام گوئی کی روایت کو ختم کیا۔ دکنی الفاظ اور بھاشا کی جگہ فارسی الفاظ پر توجہ دی اور عشق مجازی کے ساتھ ہی عشق حقیقی اور صوفیانہ خیالات غزل میں پیش کیے ان کے کلام میں درد اور اثر پایا جاتا ہے۔ دلی جذبات کے گداز نے ان کی غزل کو دلکشی بخشی۔

نوٹ

آتا ہے ہر سحر اٹھ تری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
خان آرزو

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر
سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں ہرے
شاہ حاتم

اٹھارہویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک اردو غزل نے کئی نئے موڑ لیے اور ترقی کی بہت سی نئی راہیں اپنائیں۔ اس زمانے میں شعرا نے غزل پر خاص توجہ کی۔ موضوع اور مواد کے اعتبار سے، الفاظ اور تراکیب کے لحاظ سے اور تشبیہ و استعارے کے حوالے سے بھی اس دور کی غزل زیادہ جاندار اور توانا ہے۔ اس میں وسعت اور گہرائی بڑھی۔ خواجہ میر درد، میر تقی میر، میر سوز، مرزا محمد رفیع سودا، انشاء اللہ خاں انشا، مصحفی اور جرأت اس دور کے مشہور غزل گو ہیں۔ ان لوگوں نے اردو غزل میں معنی کی ندرت، بیان کی وسعت اور فکر و خیال کی بلندی کو جگہ دی۔ میر درد نے تو خاص طور سے روحانیت اور تصوف کے مضامین کو غزل میں سمویا۔ ان کی غزل میں زبان کی پاکیزگی اور صفائی کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
میر درد

ارض و سماں کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جس میں تو سما سکے
میر درد

گل پھینکے ہیں غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
مرزا محمد رفیع سودا

برج میں دھوم ہو رہی کی و لیکن تجھ بغیر
یہ گلال اڑتا نہیں بھڑکی ہے اب یہ تن من میں آگ
سودا

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں
سودا

اردو غزل کی تاریخ میں میر تقی میرؔ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو غزل کو جو سادگی، بے ساختگی اثر، خستگی، نشتریت کے ساتھ تغزل، شیرینی، لہجہ کی نرمی، ترنم اور معنی کی گہرائی بخشی۔ میرؔ نے اپنے غم کو دنیا کے غم سے ہم آہنگ کر کے غزل کو ایک نئی کسک اور آنچ دے دی۔ غم عشق، غم روزگار اور ذاتی تجربات اور احساسات کو اچھوتے انداز سے پیش کر کے میرؔ نے اردو غزل کے فن کو چار چاند لگا دیئے...

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں، ایہام بھی نہیں
ناز کی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے
الٹی ہوگئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
میر تقی میرؔ

اس زمانے میں باہری حملوں کے سبب دلّی میں آئی تباہی نے یہاں کے بہت سے شاعروں کو دلّی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت فیض آباد اور لکھنؤ میں فارغ البالی اور اطمینان کا دور تھا۔ میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، انشاؔ وغیرہ نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ وہاں کے درباروں میں ان کی اچھی پذیرائی ہوئی۔ لکھنوی ماحول کی بے فکری اور خوش حالی نے عیش و عشرت کو بڑھاوا دیا۔ شاعری پر بھی اس ماحول کا گہرا اثر پڑا۔ زیادہ تر شاعروں نے زبان کے ظاہری حسن اور الفاظ کی شان و شوکت پر توجہ دینی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں غزل کی روح کمزور ہوگئی۔ غزل محض عیش و مسرت اور دل بہلانے کی چیز بن گی۔ خیال کی پاکیزگی اور فکر کی بلندی کی جگہ زبان کے چٹخارے پر زور دیا گیا۔ انشاء اللہ خاں انشاؔ جیسا ذہین شاعر بھی پھکڑ پن کی حدوں میں داخل ہوگیا۔ انشاؔ، رنگینؔ اور جانؔ صاحب نے ریختی کو رواج دیا۔ غزل میں عورتوں کے لہجے اور ان کے جذبات کی عکاسی کو خاص دخل ہوگیا۔

اٹھارہویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک تقریباً سوسوا سال کا عرصہ اردو زبان و ادب اور خاص کر اردو غزل کے لیے بہت بہتر تھا۔ زبان، اسلوب، موضوع ہر لحاظ سے اردو غزل نے ترقی کی۔ فارسی تراکیب کو اردو رنگ دیا گیا۔ مشکل الفاظ کی جگہ آسان اور عام فہم الفاظ کو جگہ دی گئی۔ اور غزل کے مضامین میں ملکی اور قومی مسائل کے ساتھ ہی طنز و مزاح کو داخل کیا گیا۔

اسی زمانے میں دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کا تصور قائم ہوا تو اردو غزل بھی دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے خانوں میں بٹ گئی۔ لکھنؤ والوں نے زبان و بیان پر خاص توجہ دی اور ناسخؔ نے اصلاح زبان کی اس تحریک کو پھر زندہ کر دیا جس کی ابتدا دلّی

نوٹ

میں مرزا جان جاناںؔ اور شاہ ظہور الدین حاتمؔ نے کی۔ زبان کی درجہ بندی کر دی گئی عوام کی زبان علاحدہ اور خواص کی زبان علاحدہ قرار دی گئی۔ اردو شاعری خاص طبقے اور خاص موضوعات تک سمٹ گئی۔ اور شعر گوئی پر طرح طرح کی پابندیاں لگا دی گئیں۔ ناسخؔ کے بعد ان کے شاگردوں نے اس رجحان کو اور آگے بڑھایا اور سختی سے اس پر عمل کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور میں لکھنؤ کی اردو غزل الفاظ کا پلندہ بن گئی۔ شعریت، گہرائی اور مزیت کے بجائے ظاہری حسن کے تذکرے، معاملہ بندی اور بیان کی صناعی کو جگہ دی گئی۔ کلام سے اثر اور سوز و گداز غائب ہو گیا۔

بال سلجھانا ترا کنگھی سے دل الجھائے ہے
اور بکھرا دیکھ کر بس جی ہی بکھرا جائے ہے
شیخ قلندر بخش جرأتؔ

آئے جو میرے پاس تو منہ پھیر کے بیٹھے
یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا
جرأتؔ

عجب لطف آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے
کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے
انشاؔ

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شب فرقت میں تو احسان ہوتا
ناسخؔ

جو ترے پاس سے آتا ہے پوچھوں ہوں یہی
کیوں جی کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے
رنگینؔ

زبان کی درستگی، سادگی اور صفائی پر آتشؔ لکھنوی نے بھی خاص دھیان دیا۔ مگر ان کا انداز ناسخؔ سے مختلف تھا۔ ان کی غزل میں تازگی اور شگفتگی ہے ''بانکپن'' ہے۔ فکر کی بلندی اور معنی کی وسعت و گہرائی ہے۔ آتشؔ کا دعویٰ تھا کہ ''خون جگر سے پرورش شعر ہم نے کی''۔

سن تو سہی جہاں میں ہے ترا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

حسن پری آں جلوہ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا
آتش

لکھنؤ کے برخلاف دلّی میں ماحول سنجیدہ تھا۔ یہاں وہ خوشحالی اور عیش نہ تھا۔ جس نے لکھنؤ کی غزل کو عارضی رنگینی اور رعنائی بخشی تھی۔ یہاں تو سیاسی ابتری اور پریشان حالی نے لوگوں کے مزاج میں ٹھیراؤ اور فکر کی بلندی پیدا کر دی تھی۔ لہٰذا غزل گو شاعروں کے یہاں بھی درد و غم کی کسک ہے اور بیتے ہوئے شاندار زمانے کی یادوں کی تڑپ ہے۔ اس تڑپ اور کسک نے اردو غزل کو جذبات کا گداز اور نرمی بخشی۔ یہاں غزل میں ظاہری حسن پرستی کی جگہ روحانیت، تغزل اور تہہ داری ہے۔ زبان و بیان کی پاکیزگی اور خیال کی لطافت ہے۔ شاہ نصیر، مومن، ذوق اور غالب دبستان دلّی کے اہم شاعر ہیں۔ شاہ نصیر نے زبان کی درستی اور اصلاح پر دھیان دیا۔ اپنی غزل میں نادر تشبیہوں اور مشکل زمینوں کا استعمال کیا۔ مومن خاں مومن نے شروع میں شاہ نصیر کی شاگردی کی مگر جلدی ہی اپنی ذہانت اور صلاحیت سے اردو غزل میں اپنی الگ حیثیت قائم کر لی۔ انہوں نے اردو غزل کو ایک نیا لہجہ اور نئی توانائی دی۔ بے تکلفی، خیال کی نزاکت، جدت، تشبیہ استعارے کی ندرت اور اسلوب کی تازگی سے مومن نے اردو غزل کو بہت دلکش بنا دیا ۔

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے
تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
مومن

شیخ محمد ابراہیم ذوق بھی شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے لیکن یہ بھی بہت جلد اپنے انداز میں مشہور ہو گئے۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد رہے۔ غزل کے علاوہ قصیدے میں بھی شہرت پائی۔ سودا کے بعد اردو میں قصیدہ گوئی کا سہرا ذوق کے سر ہی ہے۔ ان کی غزلوں میں سادگی اور صفائی ہے۔ خیالات پاکیزہ اور لطیف ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

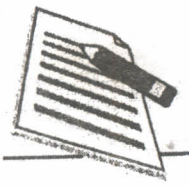

نوٹ

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
ذوقؔ دہلوی

بہادر شاہ ظفرؔ نے شاعری وراثت میں پائی تھی۔ اردو کے دو بڑے شاعروں ذوقؔ اور غالبؔ کے شاگرد ہوئے۔ اپنے ذاتی احساسات، تجربات اور حسرت وغم کو ظفرؔ نے پرلطف زبان اور پراثر انداز سے غزل میں پیش کیا۔ حالات اور واقعات کی سچائی، جذبہ، خلوص، دردمندی ظفرؔ کی غزل کی خوبیاں ہیں ۔

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ تو کسی تعارف کے محتاج ہی نہیں۔ انہوں نے اردو غزل کو جو وسعت سادگی اور پرکاری، سلاست اور روانی، اختصار اور جامعیت، فکر کی بلندی اور معنی کی گہرائی عطا کی اس نے غزل کو ایک نیا ہی رنگ دے دیا۔ غالبؔ کی غزل زندگی سے اس قدر قریب ہوگئی کہ زندگی کے سارے رنگ اس میں جھلکتے ہیں ذاتی تجربے اور مشاہدے کو جذبات اور خلوص کی آنچ دے کر غالبؔ نے جس طرح غزل میں پیش کیا یہ ان کا کمال ہے۔ غالبؔ نے اپنے مزاج کی شوخی اور بے تکلفی سے اردو غزل کو بھی شگفتگی اور تازگی بخشی۔ غم وآلام اور زندگی کے مختلف مسائل کو غالبؔ نے نئے نئے انداز سے غزل میں پیش کیا۔ انہوں نے اردو غزل کو نیا آہنگ دیا اور مضامین کی وسعت کے ساتھ ہی بیان کی شیرینی اور اثر کو بھی غزل میں داخل کیا ۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیان اور
ابن مریم ہوا کرے کوئی
مرے دکھ کی دوا کرے کوئی
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
غالبؔ

غالبؔ اور مومنؔ کے علاوہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ، منیر شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی اور داغؔ دہلوی جیسے مشہور اور اہم شاعر بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں غزل کو نیا رنگ روپ ملا۔ مضامین کی رنگارنگی اور بیان کی بے تکلفی و

نوٹ

دلکشی نے اردو غزل کو بڑی جاذبیت دی۔ امیر مینائی اور داغ دہلوی نے زبان کی شائستگی، محاورے کی درستگی، مضمون کی شوخی اور بیان کے اچھوتے پن پر بہت توجہ دی ۔

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
پر جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
داغ دہلوی

۱۸۵۷ء کے بعد اردو میں داخل ہوئی۔ جدید نظم کی ترقی اور حالی کی کڑی تنقید کا اردو غزل پر کافی اثر پڑا لوگ غزل سے بے توجہی برت کر نظم کی طرف دھیان دینے لگے۔ غزل کے خلاف باقاعدہ پروپیگنڈا شروع ہوگیا اور ایسا محسوس ہونے لگا گویا غزل کی ترقی رک گئی۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دن نہ رہی۔ کیونکہ غزل جاندار صنف ہے اور اس کا تعلق براہ راست زندگی اور اس کے مسائل سے ہے۔ لہٰذا اس مشکل دور میں غزل نے جلد ہی اپنی پوزیشن کو بہتر بنالیا۔ اس کام میں اس زمانے کے اہم شاعروں جیسے امیر اللہ تسلیم، ریاض خیر آبادی، جلال لکھنوی، صفی لکھنوی، عزیز اور آرزو وغیرہ نے خاص رول ادا کیا۔ انہوں نے غزل کی قدیم روایت کو نئے زمانے اور ادب کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ اسی لیے ان لوگوں کو قدیم اور جدید کے درمیان ایک مضبوط کڑی کی حیثیت ملی۔

انیسویں صدی کے اس دور میں سیاسی، سماجی، ادبی ہر اعتبار سے بہت تبدیلیاں ہوئیں۔ مغربی علوم کی آمد اور جدید تہذیبی رویوں نے زندگی کی بہت سے اقدار کو بدل ڈالا تو شعر و ادب پر بھی اس کا خاصا اثر پڑا۔ تیزی سے بدلتے اس زمانے میں شاد عظیم آبادی حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی اور جگر وہ بڑے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی فن کاری سے اردو غزل کو زمانے اور زندگی کا ترجمان بنایا۔ پرانی روایات اور نئے تجربوں کو ملا کر انہوں نے غزل کو احساس کی نئی قوت، جذبے کا خلوص، سچائی اور خیال کی پاکیزگی دی۔ پرانے مضامین کی جگہ نئے مسائل اور موضوعات کو غزل میں داخل کیا۔ حسرت نے سچے عاشقانہ جذبات کو پیش کر کے غزل کو سیاسی شعور بھی دیا۔ ملکی اور قومی مسائل کو غزل کا موضوع بنایا۔ اسی لیے ان کی غزل میں زندگی کا حسن اور حرارت دونوں موجود ہیں ۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
ہے مشک سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
حسرت موہانی

جگر نے اردو غزل کو تغزل کی شیرینی اور ترنم سے مالا مال کیا۔ عاشق اور محبوب کے جذبات کی ترجمانی بڑے فن کارانہ انداز

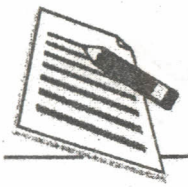

نوٹ

میں کر کے غزل کو انوکھا حسن بخشا۔ جب کہ اصغرؔ نے تغزل اور حسن آفرینی کے ساتھ تصوف کے مضامین سے بھی غزل میں وسعت پیدا کی۔ ان کے یہاں فکر کی بلندی ہے۔ ان کی سوچ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ اپنے وسیع خیالات اور احساسات کو انہوں نے خوب صورت تشبیہوں اور ترکیبوں اور نئی علامتوں کے ساتھ پیش کر کے غزل کو خوشگوار لہجہ اور تازہ حسن دیا ۔

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم دیا اسے غم جاناں بنا دیا
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے، کہ گلستاں بنا دیا

جگرؔ

فانیؔ بدایونی نے اپنے غم و آلام کی آمیزش سے اردو غزل کو نیا احساس اور گداز بخشا۔ انہوں نے حیات اور غم کے فلسفے کو غزل میں سمویا۔ خستگی، محرومی اور کسک نے ان کی غزل کو ایک علحیدہ رنگ دیا ۔

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

فانیؔ

حسرتؔ، فانیؔ، جگرؔ اور اصغرؔ کے علاوہ بھی اس زمانے میں بہت اہم شاعر ملتے ہیں۔ جنہوں نے غزل کی روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ زندگی کے نت نئے تجربوں کو اس میں شامل کر کے غزل کے لہجہ میں طاقت اور توانائی پیدا کی۔ اور اس کو خالص ہندوستانی رنگ اور ہندوستانی تہذیب میں ڈھالا۔ اس سلسلے میں فراقؔ گورکھپوری، اخترؔ شیرانی، سیمابؔ اکبرآبادی اور علامہ اقبالؔ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ فراقؔ نے ہندو دیومالائی عناصر اور اساطیری روایات کو غزل کا حصہ بنایا اور غزل میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کی۔ انہوں نے برج بھاشا، کھڑی بولی اور اودھی کی تراکیب اور محاوروں کو غزل کی زبان میں استعمال کر کے اردو غزل کی زبان کو وسعت دی۔

اقبالؔ نے اردو غزل کی نئی معنویت اور گہرائی دی۔ انہوں نے نئی فکر اور نیا لہجہ غزل میں اپنا کر اس کو فن کی بلندی پر پہنچایا۔ ان کی غزل کا تعلق صرف دلی جذبات سے نہیں دماغ سے بھی ہے۔ انہوں نے خیال کی نئی راہیں دکھائیں ۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

اقبالؔ

نوٹ

روشنائی زیادہ نظر آتی۔

ایک مہینے کے قریب یہی ہوتا رہا لیکن اب سرخی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ اور کوئی تین ماہ بعد بغیر تصحیح کے اس لڑکے کی ترجمہ کی ہوئی خبر چھپی۔ اس نوعمر صحافی کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ کئی برس استاد کے ساتھ کام کیا۔ کھانا گھر میں سے آجاتا۔ استاد کپڑے بنا دیتے۔ بعد میں معمولی سی تنخواہ مقرر کر دی۔

اس نوجوان صحافی نے صحافت سیکھی لگن سے۔ صحافت کا پہلا اصول ہے لگن۔ شوق، مستقل مزاجی۔

صحیفہ عربی کا لفظ ہے جس کے معنی اردو میں ہیں کتاب یا ورق۔ صحافت اسی سے بنا ہے۔ لیکن کتاب کے بدلے اس کے معنی ہو گئے اخبار نکالنے کا فن، اخبار، خبر کی جمع، یعنی خبروں کا مجموعہ صحافی کو تاریخ کا گواہ کہا گیا ہے۔ جو کچھ آج ہو رہا ہے، صحافی اسے دیکھتا ہے اور چھاپ دیتا ہے۔ آج کی خبر کل تاریخ میں چلی گئی۔ اس لیے صحافی اس واقعے یا خبر کا سب سے مستند گواہ ہے۔

اخبار یا خبر نامے وقفہ اشاعت کے لحاظ سے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ روزانہ، سہ روزہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ، ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ۔ ان میں ہر ایک کا مقصد اور دائرۂ کار مختلف ہے۔ روزنامے اس کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ شہر، علاقے، ملک یا دنیا کی خبریں سب سے پہلے اپنے اخبار کے قارئین تک پہنچائیں۔ وہی اخبار اچھا سمجھا جاتا ہے جو تازہ بہ تازہ خبریں دیتا ہے۔ کسی اور قسم کے اخبار تازہ خبروں کے لیے نہیں نکالے جاتے۔ ان کے مقاصد کچھ اور ہوتے ہیں۔ یہ اخبار یا رسالے تازہ خبروں پر زور نہیں دیتے بلکہ کسی خاص قسم کے مضامین اور خبریں شایع کرتے ہیں۔ کچھ رسائل ادبی ہیں تو کچھ کسی اور موضوع کو اپنا دائرہ کار قرار دیتے ہیں۔ اس دائرۂ کار کو پالیسی کہتے ہیں۔ مثلاً کچھ رسائل یا اخبار مذہبی ہوتے ہیں، کچھ کھیل سے متعلق، کچھ سائنسی ہوتے ہیں تو کچھ تعلیمی اور ان سب دائروں میں کام کرنے والے صحافی ہیں اور ان کا عمل صحافت۔

کسی روزنامے کے صحافی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ خبروں وغیرہ کو زبان کے اعلیٰ معیار پر شایع کر سکیں۔ لیکن ایسے فیچر یا مضامین جن کی اشاعت میں تعجیل ضروری نہ ہو، زبان اور ادب کے لحاظ سے بہتر ہوتے ہیں۔ اچھے روزناموں میں ایسے صحافی رکھے جاتے ہیں جو زبان اور ادب کے اعلیٰ معیار کو باقی رکھتے ہیں۔ سہ روزہ اور ہفتہ وار اخبار نویسوں کے پاس خبروں کو بہتر انداز میں شایع کرنے کا وقت ہوتا ہے۔ ان کے یہاں معیار، عجلت کے مقابلے میں اہم ہوتا ہے۔ بعض اخبار بھڑکیلی سرخیوں کے ساتھ اخبار کو زیادہ خوبصورت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ پندرہ روزہ اور ماہنامے علم و آگہی کے کسی ایک موضوع پر نکالے جاتے ہیں۔ مثلاً سیاسی، ادب، سائنس، تعلیم، کھیل کود، مذہب وغیرہ۔ سہ ماہی اور ششماہی رسائل عام طور پر ادبی یا کسی موضوع پر تحقیقی مواد پیش کرتے ہیں۔ سالانہ اشاعت والے میگزین عام طور پر تعلیمی اداروں کی طرف سے نکلتے ہیں۔ ان میں ادارے کے کارہائے نمایاں کی رپورٹ ہوتی ہے اور آنے والے زمانے کے عزائم شایع ہوتے ہیں۔

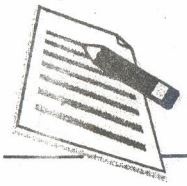

نوٹ

گزرتی رہی ہے.....اور وہ کبھی بھی صرف اپنے لغوی معنی میں محدود نہیں رہی۔ بلکہ کبھی اس میں عشق و رومان کے قصے بیان کیے گئے تو کبھی پند و نصائح کا کام اس سے لیا گیا۔ کبھی وطن کی عظمت اور محبت کو غزل کا موضوع بنایا گیا۔ کبھی سرمایہ داری کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔ کبھی معاشرے کی بے چینی اور کرب کو غزل نے آئینہ کر دیا۔ غرض یہ کہ واقعتاً ''ہماری پوری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہوئی ہے۔'' اس لمبے تاریخی سفر میں غزل ہمیشہ اپنی روایات سے جڑی رہی۔ غم محبوب اور عشق کی کسک آج بھی غزل کا موضوع ہے اور خیال کی وسعت کے ساتھ بیان کی رنگینی، لہجہ کا رس، جذبے کا رچاؤ محبت کی گرمی اور حسن کی نرمی آج بھی غزل کی خصوصیات میں شامل ہیں۔

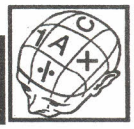

آپ نے کیا سیکھا

غزل کا ہر شعر معنی اور مطلب کے اعتبار سے مختلف اور اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔ غزل کے تمام اشعار ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ پہلے شعر کو مطلع اور آخری شعر کو مقطع کہا جاتا ہے۔

غزل شاعر کے جذبات قلبی واردات و کیفیات اور حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ نرمی، تازگی، سادگی، شیرینی، بے ساختگی، لطافت اور نغمگی غزل کی خصوصیات ہیں۔

سولہویں سترہویں صدی میں دکن کے مشہور غزل گو شعراء کے نام ہیں، معانیؔ، عوامیؔ، حسن شوقیؔ، ملا خیالی اور ولیؔ دکنی۔

اٹھارویں انیسویں صدی میں غزل میں وسعت اور گہرائی بڑھی۔ اس دور کے مشہور غزل گو شعراء ہیں۔

خواجہ میر دردؔ، میر تقی میرؔ، میر سوزؔ، سوداؔ، انشاء اللہ خاں انشاؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ وغیرہ۔ میر دردؔ نے خاص طور پر روحانیت اور تصوف کو غزل میں سمویا۔

انیسویں صدی میں باہری حملوں کے سبب بہت سے شعراء لکھنؤ اور فیض آباد چلے گئے۔ لکھنؤ میں ناسخؔ اور ان کے شاگردوں نے غزل میں شعریت اور گہرائی کی جگہ ظاہر حسن، معاملہ بندی اور بیان کی صناعی کو جگہ دی۔

جو شعراء دہلی میں رہ گئے ان میں شاہ ظفرؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور غالبؔ مشہور ہوئے۔ دلّی کی غزل میں درد و غم کی کسک ہے، جذبات کا گداز اور نرمی ہے، ظاہر حسن کی جگہ روحانیت، تغزل اور تہ داری ہے۔ غالبؔ نے غزل کو ایک نیا رنگ دیا۔ انہوں نے اردو غزل کو وسعت، پرکاری، سلاست اور روانی، اختصار اور جامعیت، فکر کی بلندی اور معنی کی گہرائی عطا کی۔

۱۸۵۷ء کے بعد اردو غزل ایک نئے دور میں شامل ہوئی۔ شاد عظیم آبادی، حسرتؔ موہانی، اصغرؔ گونڈوی، فانیؔ بدایونی اور جگرؔ اس دور کے بڑے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی فن کاری سے اردو غزل کو زمانے اور زندگی کا ترجمان بنایا۔ پرانے مضامین کی جگہ نئے مسائل اور موضوعات غزل میں داخل ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی اس زمانے میں بہت اہم شاعر ملتے ہیں۔ انہوں نے غزل کو خالص ہندوستانی رنگ میں ڈھالا۔ اس سلسلے میں فراقؔ گورکھپوری، اخترؔ شیرانی، سیمابؔ اکبر آبادی اور علامہ اقبالؔ

نوٹ

خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۹۳۶ء کا زمانہ غزل کے لیے ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے کچھ شاعروں نے نئے نئے تجربے کیے۔ اشتراکی نظریات اردو ادب میں راہ پا گئے۔ اس دور کے شعراء میں فراقؔ، مجنوںؔ، مجازؔ، جذبیؔ، مخدومؔ، نظم گو مجروحؔ سلطانپوری، غلام ربانی تاباںؔ، جاں نثار اخترؔ، فیض احمد فیضؔ وغیرہ اہم ہیں۔

اختتامی سوالات

1. غزل کے اشعار کی کیا خوبیاں ہیں؟
2. سولہویں سترہویں صدی کے چار مشہور شعراء کے نام لکھیے؟
3. اٹھارویں انیسویں صدی کی غزل میں کیا خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اس دور کے چار غزل گو شعراء کے نام لکھیے؟
4. دلّی اسکول کے چار غزل گو شعراء کے نام لکھیے؟
5. دلّی اسکول اور لکھنؤ اسکول کی غزل میں کیا فرق ہے؟
6. ایسے دو شاعروں کے نام لکھیے جنہوں نے اردو غزل کو خالص ہندوستانی رنگ اور ہندوستانی تہذیب میں ڈھالا؟
7. ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے دو شعراء کے نام لکھیے؟